سمیع الحق
پی-ایچ-ڈی سکالر
اسلامیہ کالج یونیورسٹی، پشاور

میرؔ کی شاعری میں دل کی علامتی حیثیت

The symbolism of "Heart" in Mir's poetry

ABSTRACT:

Mir Taqi Mir's being the most prominent classical Urdu poet posess a pivotal place among all other Urdu poets. He has been admired in almost every period of the Urdu poetry, especially in the field of "Gazal", like all other poets, Meer has also used a vast field of symbols in his poetry. Among them the symbol of "Heart" is the most visible and the dominant symbol in his poetry. Being a skimmer of the world of the Tasawwuf, the symbol of "Heart" becomes more and more important for him. This article describes his symbolism with respesct to human heart and explains various aspects of his "Heart's Symbolism".

Key Words: Symbolism, Classic, Tasawwaf, Symbol of Heart.

الفاظ و معنی کا جادو گر شاعر میر تقی میرؔ(1722ء- 1810ء)اردو کلاسیکی شعرا میں خدائے سخن کے نام سے جانا جاتا ہے۔وہ اپنی زندگی کے تینوں ادوار یعنی بچپن، جوانی اور بڑھاپے میں شاعری کے حوالے سے اتنا معتبر اور فعال رہا کہ ہر دور میں اس کے زبان کو سند کا درجہ دیا گیا۔اس نے ڈھائی ہزار سے زیادہ غزلیں کہی ہیں اور تمام کے تمام اعلیٰ پائے کی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اسے "شہنشاہ غزل" کہا گیا ہے۔کلام میرؔ کا ایک منفرد پہلو یہ ہے کہ اس نے اپنی شاعری میں انسان کے اعضائے بدن کو کافی جگہ دی ہے۔اس کی شاعری میں مختلف اعضائے بدن کا ذکر مختلف حوالوں سے موجود ہے۔میدانِ تصوف میں دل کو بنیادی اور مرکزی حیثیت حاصل ہے اس لیے تصوف کی دنیا کے باسی ہونے کی بنا پر بدن کے تمام اعضا میں سے دل اس کا سب سے پسندیدہ اور مرغوب عضو ہے۔اس شاعری میں موضوعاتی، معنیاتی اور علامتی حوالوں سے انسانی دل کا تذکرہ موجود ہے۔

میرؔ کے کلام کا ایک بڑا موضوع انسان ہے۔انسان کا لفظ "انس" سے ماخوذ ہے جس کا رشتہ لامحالہ عشق و محبت سے جڑا ہوا ہے اور ان سب کا تعلق چوں کہ دل سے ہوتا ہے اس لیے اس کے نزدیک دل ہی انسانی جسم کا بادشاہ ہے بلکہ ایک لحاظ سے انسانی جسم کا مرکز و محور بھی ہے۔اس کی بربادی یا آبادی انسانی جسم کی آبادی و بربادی

تصور کی جاتی ہے۔ میرؔ کے نزدیک دل کو انسانی اعضائے بدن میں وہ تخصیصی مقام حاصل ہے جس کی بدولت وہ حقیقی مطلق کے ادراک اور مسکن کا منبع تصور ہوتا ہے۔ دل اگرچہ گوشت پوست کا ایک لوتھڑا ہے مگر عظمت کے اس مقام پر ایستادہ ہے جہاں سے عرش تک رسائی ممکن ہے، نیز فرش سے عرش تک کے سفر کو طے کرنے کی طاقت بھی رکھتا ہے۔ وہ دل کو کہیں مکان، کہیں ہمت، کہیں غم، کہیں موت، کہیں انتشار، کہیں بے قراری، کہیں ہنگامہ، کہیں اختتام زندگی، کہیں تخلیق خواہش، کہیں مرکزیت، کہیں بے صبری، کہیں پاگل پن، کہیں طاقت، کہیں اطمینان، کہیں تخریب، کہیں عظمت اور بعض دفعہ بصیرت کی علامت سے تعبیر کرتا ہے۔

انسانی وجود میں دل ایک ایسا عضو ہے جس سے انسانی جسم کے تمام حرکات و سکنات مع غم و خوشی منسلک ہیں۔ انسان کے خوش رہنے یا مغموم رہنے میں اس کا ایک اہم کردار ہے۔ یہی دل ہے جو ایک طرف انسان کو خوشی کے تمام مواقع فراہم کرتا ہے تو دوسری طرف اسے غموں کے ڈھیر میں دھکیل کر ایک ہنگامی صورتحال سے دوچار کرتا ہے جس سے انسان کا جینا تک محال ہو جاتا ہے۔ اس لیے میرؔ دل کو ہنگامے کی علامت میں پیش کر کے یہ واضح کر دیتا ہے کہ اس سے انسانی زندگی محال ہو جاتی ہے۔ جیسے:

ہنگامہ گرم کن جو دلِ ناصبور تھا
پیدا ہر ایک نالے سے شورِ نشور تھا[1]

میرؔ کے ہاں کہیں کہیں دل زندگی کی علامت میں موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر دل میں طاقت اور قوت ہو تو زندگی کے تمام امور و رشتے بخوبی نبھائے جا سکتے ہیں اگر اس سے قوت اور زندہ دلی کا جذبہ ختم ہو جائے تو انسان کا اس دنیا میں جی لگنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جس طرح امام بخش ناسخؔ (1722ء- 1838ء) کہتا ہے:

زندگی زندّہ دلی کا ہے نام
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں[2]

اسی طرح میرؔ بھی دل کو زندگی کی علامت گردان کر اسے زِندّہ دلی سے منسلک کرتا ہے:

اس کے گئے پر ایسی گئی دل سے ہم نشیں
معلوم بھی ہوا نہ کہ طاقت کو کیا ہوا[3]

زندہ دلی اگر انسانی زندگی کا اقتضا ہے تو پھر یہ بات لازم ہے کہ دل کا روگ اس زندگی کا خاتمہ تصور ہو۔ لہٰذا جب انسانی زندگی کا اختتام قریب ہو تو نتیجتاً تمام تدبیریں الٹی ہو کر موت واقع ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ مولانا رومؒ (1207ء-1273ء) کہتا ہے:

چوں قضا آید طبیب ابلہ شد
آں دوا در نفعِ خود گمرہ شد[4]

(مفہوم: جب قضا آتی ہے تو طبیب کا عقل بھی کام چھوڑ جاتا ہے اور وہ دوا خود نفع دینے کی بجائے نقصان دینے لگتی ہے)

اسلامی نقطہ نظر سے بھی یہ بات درست ہے کہ جب کسی آدمی کی زندگی ختم ہو جائے تو ایک ساعت کے لیے نہ آگے ہو سکتا ہے نہ پیچھے۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۚ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ "
(القرآن، سورۃ اعراف، آیت نمبر 34)

(مفہوم: اور ہر ایک امت کے لیے ایک وقت مقرر ہے جب وہ وقت مقرر آجائے تو نہ ایک ساعت کے لیے واپس یعنی پیچھے ہو سکیں گے اور نہ یک ساعت کے لیے آگے ہو سکیں گے۔)

میر بھی اس اسلامی نقطہ نظر کا حامی ہے اس لئے دل کو بیماری سے منسلک کر کے اختتام زندگی کی علامت گردانتا ہے ۔ جیسے:

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں، کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا[5]

مشرقی سماج میں عشق مجازی کو معیوب نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ میر بھی چوں کہ اسی تہذیب کا پروردہ ہے اس لیے کہتا ہے:

پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی[6]

اسی رسوائی اور بدحالی کو مد نظر رکھتے ہوئے میرؔ دل کو بربادی کی علامت گردان کر مثال میں خود اپنی مثال پیش کرتا ہے:

لگا نہ دل کو کہیں ، کیا سنا نہیں تو نے
جو کچھ کہ میرؔ کا اس عاشقی نے حال کیا[7]

دل دینے کی ایسی حرکت اُن نے نہیں کی
جب تک جیے گا میرؔ پشیمان رہے گا[8]

عشق و محبت کے میدان میں نظر کی اہمیت مسلّمہ ہے کیوں کہ اس کی ابتدا اسی سے ہی ہوتی ہے۔ جیسا کہ اقبال (1877ء-1938ء) کہتا ہے:

محبت چیست؟ تاثیرِ نگاہیست
چہ شیریں زخمے از تیر نگاہیست[9]

(مفہوم: محبت کیا ہے؟ نظر کی تاثیر ہے۔ نظر کے تیر کا زخم کتنا شیرین اور میٹھا ہے)

یہی نظر ہے جس سے محبت کا آغاز ہوتا ہے جب کہ بعد ازاں عاشق کے لیے درد و غم اور موت کا سبب تک بن جاتا ہے جیسا کہ غالبؔ (1797ء-1869ء) کہتا ہے:

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا[10]

اردو کلاسیکی شاعری میں بھی عاشق کی روایتی کیفیت ہی بیان کی جاتی ہے جو معشوق کے تیرِ نگہ کو موت کا پیام سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرؔ کے ہاں دل عاشق کی علامت میں برتا گیا ہے جسے معشوق کی ترچھی نگاہ سے منسلک کیا ہے:

کس دل سے ترا تیرِ نگہ پار نہ گزرا
کس جان کو یہ مرگ کا پیغام نہ آیا[11]

انسانی وجود میں دل کو مرکزیت حاصل ہے۔ سائنسی نظریہ ہے کہ یہ انسانی وجود کے ہر عضو کو خون فراہم کرتا ہے۔ اس فراہمی میں اگر کمی بیشی آجائے تو نتیجے میں انسانی جسم کا تمام نظام منتشر ہو جاتا ہے جو کہ اس بات کی دلیل ہے کہ سائنس بھی دل کی مرکزیت کو تسلیم کرتا ہے۔ میرؔ کے ہاں بھی دل اسی مرکزیت کی علامت بن کر ایک طرف دنیا کی گہما گہمی میں مگن، تو دوسری طرف انسان کی ذاتی زندگی سے منسلک ہے۔ علاوہ ازیں جہاں تک جذبِ محبت کی بات ہے تو یہ تمام بنی نوع انسان کی خمیر میں شامل ہے جو انسانی دل میں شعلہ یا چنگاری بن کر سارے تن کو جلا کے راکھ کر دیتی ہے یعنی انسان کی انا ختم ہو کر کسی ماورا جسم کو اپنا سمجھ لیتا ہے۔ یہی وجوہ ہیں کہ میرؔ دل کو مرکزیت کی علامت میں بھی پیش کرتا ہے:

دل بہم پہنچا بدن میں ، تب سے سارا تن جلا
آ پڑی یہ ایسی چنگاری کہ پیراہن جلا[12]

میرؔ دل کو علامت برائے مرکزیت گردان کر اسے دونوں جہانوں کے امور پر محیط کرتا ہے:

جو یہ دل ہے تو کیا سرانجام ہو گا
تہِ خاک بھی خاک آرام ہو گا[13]

اردو کلاسیکی شعری روایت میں عاشق عموماً اپنے محبوب کا متلاشی رہتا ہے کیوں کہ عشق میں مبتلا آدمی معشوق کی دوری اور جدائی برداشت نہیں کر سکتا اور بے صبری سے وصل کا خواہاں رہتا ہے۔ محبت کے جذبے کے آگے انسان بے بس ہے کیوں کہ اس لمحے انسان کے پیش نظر صرف اپنی جمالیاتی ذوق کی تسکین کرنی ہوتی ہے۔ بعد ازاں انسان جب شعوری طور پر سوچنے لگتا ہے تو بغیر سوچ اور سمجھ کے محبت میں مبتلا نظر آتا ہے۔ اس تمام فعل میں سب سے زیادہ اور نمایاں جذبہ بے صبری کا ہے اور یہ جمالیاتی ذوق کی تسکین کا تقاضا بھی ہے جسے دل سے جوڑا گیا ہے۔ یہی بنیادی وجہ ہے کہ میرؔ دل کو بے صبری کی علامت گردانتا ہے۔ جیسے:

جا پھنسا دامِ زلف میں آخر
دل نہایت ہی بے تامل تھا[14]

دل سے شوقِ رخِ نکو نہ گیا
جھانکنا تاکنا کبھو ، نہ گیا[15]

دل کو گھر یا مکان کہنے کی روایت عرصۂ دراز سے چلی آ رہی ہے۔ عوام اور خواص عموماً دل کو گھر یا مکان سے تشبیہ دیتے آ رہے ہیں۔ اسی طرح اردو ادب کے شعری روایت میں بھی اس کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے کیوں کہ تقریباً ہر شاعر نے اسے گھر، مکان یا ٹھکانے سے ہمکنار کیا ہے اس لیے میرؔ نے دل کو گھر یا مکان کی علامت میں برتا ہے:

دل سے مت جا کہ حیف اُس کا وقت
جو کوئی اُس مکان سے نکلا[16]

دل کی آبادی کو پہنچا اپنے گویا چشم زخم
دیکھتے ہی دیکھتے یہ شہر سب ویراں ہوا[17]

عشق حقیقی ہو یا مجازی دونوں میں انسان اپنی عقل و دانش سمیت اپنی شخصیت کھو بیٹھتا ہے۔ عشق مجازی میں اس کا زیادہ تر تعلق نارسائی اور محرومی سے ہوتا ہے جب کہ عشق حقیقی کے میدان میں ایک موقع پر عاشق سفر کرتے ہوئے دنیاومافیہا سے لاتعلق ہو جاتا ہے اور اس کی لو اس حقیقی ذات سے لگ جاتی ہے جس کی وجہ سے دنیا کے دیگر نادان لوگ اسے دیوانہ پاگل یا مجنون قرار دیتے ہیں۔ اس پاگل پن اور جنون کی ایک وجہ بھی ہے کہ انسانی دل میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ ان تجلیات اور نورانیت کو اپنے اندر جذب کر لے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جو عجائبات اس پر آشکارا ہو جائے بعد ازاں اسے دوبارہ تلاش کرنے میں سرگرداں رہتا ہے۔ دونوں صورتوں میں انسان پاگل یا جنونی بن جاتا ہے جب کہ تصوف کی اصطلاح میں اسے مجذوب کہا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرؔ کے ہاں کہیں کہیں دل اسی پاگل پن یا جنون کی علامت میں موجود ہے:

نے دل رہا بجا ہے ، نہ صبر و حواس و ہوش
آیا جو سیلِ عشق سب اسباب لے گیا[18]

میرؔ کے ہاں دل مغائرت (غیر ہونے کی) کی بھی ایک علامت ہے جس کا انسلاک محبت سے کیا گیا ہے۔ محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو کل بنی نوع انسان میں موجود ہے۔ اس جذبے کے تحت دل انسانی وجود میں ہو کر بھی بیگانہ ہو جاتا ہے کیوں کہ اسے آرام اور تسکین صرف اپنے محبوب کے وصل سے ملتی ہے ورنہ یہ غیر بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرؔ نے دل کو مغائرت کی علامت میں پیش کیا ہے جس سے ایک طرف جذبۂ محبت کا تجزیہ ممکن ہے تو دوسری طرف روایتی محبوب کی خصلت واضح ہو جاتی ہے۔ جیسے:

کیا کہے حال کہیں دل زدہ جا کر اپنا
دل نہ اپنا ہے محبت میں نہ دلبر اپنا[19]

انسانی وجود میں دل ایک ایسی متحرک شے ہے جو ایک طرف انسان کو غم، درد اور ہنگامے سے دوچار رکھتا ہے تو دوسری طرف سرور مہیا کر کے اطمینان کی کیفیت بھی فراہم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرؔ کے ہاں دل غم گساری کے ساتھ ساتھ کیفیتِ اطمینان کی بھی علامت ہے جسے وصل سے جوڑا گیا ہے۔ حقیقتاً یا مجازاً وصل کے لمحے میں سرور اور اطمینان ہی ہوتا ہے۔ جیسے:

دل رہے وصل جو مدام رہے
مل گئے اس سے گاہ گاہ تو کیا[20]

میرؔ کے ہاں دل تخریب کی بھی ایک علامت ہے جسے محبوب کے عشق سے وابستہ کیا گیا ہے۔ غالبؔ بھی اس تخریب کا شکار نظر آتا ہے :

عشق نے غالبؔ نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے[21]

عشق و محبت انسان کو دنیاوی کاموں سے باز رکھتا ہے جس کی وجہ سے اس کی معاشرتی زندگی کے ساتھ ساتھ اس کی شخصیت بھی متاثر ہوتی ہے اور نتیجے میں انسان کسی کام کاج کا نہیں رہتا بلکہ تخریب کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسی لیے میرؔ دل کو تخریب کی علامت گردانتا ہے:

کسو کے بال درہم دیکھتے میرؔ
ہوا ہے کام دل برہم ہمارا[22]

انسانی دل کی سب سے بڑی عظمت یہ ہے کہ اس سے نکلی آہ کے سامنے کوئی بھی چیز حائل نہیں ہوتی بلکہ تمام آسمانوں کو چیر کر اناً فاناً عرش معلیٰ تک پہنچ جاتی ہے۔ اقبال بھی اس بات کا معترف ہے:

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے[23]

یہی وجہ ہے کہ میرؔ دل کو عظمت کی علامت میں پیش کرتا ہے جس کی ایک آہ سے پورے آسمان پر گرد و غبار چھا جاتا ہے:

دل کی کدورت اپنی اک شب بیاں ہوئی تھی
رہتا ہے آسماں پر تب سے غبار ہر شب[24]

غم ایک ایسا جذبہ ہے جس کی تپش اور حرارت اگر انسان کے علاوہ کسی اور شے پر ڈال دی جائے تو وہ اس کی تاب نہ لا کر ریزہ ریزہ ہو جائے گی جیسا کہ غالبؔ کہتا ہے:

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا [25]

باوجود اس تپش اور حدّت کے انسان اسے سہہ کر زندگی گزار لیتا ہے اس لیے میرؔ دل کو افراطِ غم کی علامت گردان کر دنیاوی زندگی اور عالمِ برزخ کی زندگی سے وابستہ کر دیتا ہے کہ غم کی حدّت سے پورا کفن تر ہو چکا ہے:

دل لے گیا تھا زیرِ زمیں میں بھرا ہوا
آتا ہے ہر مسام سے میرے کفن میں آب[26]

انسانی زندگی کے مختلف ادوار (بچپن، جوانی، بڑھاپا) ہوتے ہیں۔ ہر دور میں اس کی چاہت یعنی خواہش الگ الگ ہوتی ہے کیوں کہ یہ جذبہ یعنی خواہش اسے پیدائش کے ساتھ ہی ودیعت کی جاتی ہے، یہ جذبہ بہ طور جبلت تمام بنی نوع انسانوں میں فطرتاً موجود ہوتا ہے جس کے سہارے وہ اپنی زندگی جیتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر انسان میں یہ جذبہ فطرتاً موجود ہے اور اپنی ساری زندگی کسی نہ کسی خواہش کے تحت گزار لیتا ہے تو اس جذبے کا تخلیقی مرکز و منبع کیا ہے؟ کچھ غور فکر کرنے کے بعد یہ بات آشکارا ہو جاتی ہے کہ اس کا تخلیقی مرکز و منبع دل ہے جس سے ہر لمحہ خواہشات کی بھرمار پھوٹ نکلتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر انسان خواہش کا مارا ہوا ہے۔ لھٰذا میرؔ ایک شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ انسانی فطرت اور خصائل کا گہرا شعور بھی رکھتا ہے اس لیے کہیں کہیں دل کو تخلیق خواہش کی علامت میں پیش کرتا ہے۔ جیسے:

ہزاروں خواہشِ مردہ نے سر دل سے نکالا ہے
قیامت جی پہ ہے دیدار کو ٹک عام کریے اب[27]

اسی طرح میرؔ دل کو تخلیقِ خواہش کی علامت گردانتے ہوئے یہ بھی واضح کر دیتا ہے کہ ان ہی خواہشات کو محفوظ کرنے کا مقام اور ٹھکانا بھی یہی دل ہے۔ جیسے:

دل کے دل ہی میں رہ گئے ارمان
کم رہا موسمِ شباب بہت[28]

محبت ایک کائناتی جذبہ ہے جس سے تمام بنی نوع انسان بہرہ ور ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی کے دل میں یہ جذبہ شدت سے پایا جاتا ہے تو کسی کے ہاں کم لیکن ہوتا ضرور ہے۔ محبت کا جذبہ توسیع کا متقاضی رہتا ہے یعنی اس میں کمی کے بجائے وسعت ہوتی رہتی ہے۔ اس کی مثال مجاز سے حقیقت کی طرف سفر ہے جس میں ایک انسان مجازی محبت کے دائرے سے نکل عشقِ حقیقی کے میدان میں قدم رکھ لیتا ہے جس کی کوئی انتہا ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میرؔ کے ہاں دل اسی توسیعِ محبت کی علامت میں موجود ہے:

دل کا الجھنا اپنے ایسا نہیں کہ سلجھے
ہیں دامِ زلف میں ہم اُس کے اسیر صاحب[29]

میرؔ کے ہاں دل انتشار کی ایک انوکھی علامت ہے جس کا انسلاک تمام بنی نوع انسان سے کیا گیا ہے۔ وہ دل کو آفت کا منبع اور سرچشمہ گردانتا ہے جس کی چنگل سے ایک انسان بھی آزاد نہیں۔ میرؔ کی اس علامت پر غور کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اگر قالبِ آدم کے بیچ یہ گوشت کا ٹکڑا یا خون کا لوتھڑا (دل) نہ ہوتا تو شائد آج انسان اتنے مصائب اور تکالیف سے دوچار نہ ہوتا۔ اس لئے وہ انتہائی افسوس کا مظاہرہ کرتے ہوئے دل کو انتشار کی علامت گردانتے پر مجبور ہے:

دل یہی نہ جس کو دل کہتے ہیں اس عالم کے بیچ
کاش یہ آفت نہ ہوتی قالبِ آدم کے بیچ[30]

وجودیت کے علمبرداروں میں دو مکاتیب فکر (To Exist and To Live) کے لوگ ہیں۔ ایک مکتبِ فکر والے انسان کو بااختیار سمجھتے ہیں کہ انسان اپنا کردار خود بنا سکتا ہے جب کہ دوسرے مکتبِ فکر والے انسان کو ہر کام میں بے بس اور مجبور مانتے ہیں کہ انسان تقدیر کے ہاتھوں مجبور ہے اور اپنا کردار خود نہیں سنوار سکتا۔ میرؔ بھی وجودیت کے مسئلے میں دوسرے مکتبہ فکر کا ماننے والا نظر آتا ہے کیوں کہ وہ دل کو بے بسی کی علامت میں ایسے پیش کرتا ہے جس سے آزادی، اسے صرف موت میں نظر آتی ہے۔ جیسے:

ہم سے بِن مرگ کیا جدا ہو ملال
جان کے ساتھ ہے دلِ ناشاد[31]

کہیں کہیں میرؔ وجودیت کے دونوں مکاتیب فکر کا حامی نظر آتا ہے یعنی وہ انسان کو بااختیار بھی سمجھتا ہے اور تقدیر کے ہاتھوں مجبور بھی۔ اس لیے دل کو شجاعت، ہمت اور حوصلے کی علامت گردانتے ہوئے کہتا ہے کہ انسان کو محض تقدیر کے ہاتھوں مجبور نہیں ہونا چاہیے:

دل قوی رکھ، فلک کی زبردستی پر نہ جا
گر کشتی لگ گئی ہے تو تو بھی تلاش کر[32]

عشق دل کا ایک عارضہ ہے کیوں کہ یہ اپنے اندر خود آگ کی مانند ہے جو محبوب کے علاوہ ہر اک شے کو راکھ کر دیتا ہے۔[33] چنانچہ عشق اگر حقیقی حوالے سے ہو تو آگے چل کر انسان فلاح دارین پالیتا ہے اور اگر مجازی محبوب سے وابستہ ہو جائے تو عموماً شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے۔ عشق مجازی میں گرفتار انسان دو قسم (سماجی اور جسمانی) کے نقصان اٹھاتا ہے۔ جسمانی لحاظ سے دل کا عارضہ لاحق ہوتا ہے جس کی وجہ آٹھوں پہر مغموم، بے قرار اور چہرہ زرد زرد رہتا ہے اس طرح سماجی حوالے سے خوف، شرمندگی اور رسوائی کے علاوہ کچھ بھی ہاتھ نہیں آتا۔ بالخصوص

مشرقی سماج میں عشق مجازی کو معیوب جانا جاتا ہے لیکن ان سب کے باوجود اہل تصوف اس بات پہ متفق ہیں کہ عشق مجازی ہی عشق حقیقی کا پہلا زینہ ہے۔ اس بِنا پر عشق مجازی کی اہمیت سے انکار کسی طور ممکن نہیں۔ لہٰذا میر دؔل کو عشق کی علامت گردان کر اسے مجاز سے وابستہ کر دیتا ہے اور نوع انسان کو سخت الفاظ میں وعظ کرتا ہے کہ خبر دار اللہ سے پناہ مانگ لو اور دل لگانے سے باز آجاؤ:

مانگ پناہ خدا سے بندے ، دل لگنا اک آفت ہے
عشق نہ کر ، زنہار نہ کر ، واللہ نہ کر ، باللہ نہ کر[34]

انسانی وجود اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ایک کرشمہ ہے اور اس کے اندر دل کی صنعت گری خالقِ کل کا ایک انوکھا عجوبہ، جس کے بارے میں حضرت انسان ایک چند باتوں کے علاوہ کچھ نہیں جانتا۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ (1863ء-1943ء) نے فرمایا:

"دل کو اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے بنایا ہے"[35]

اگر کسی شے کو اللہ تعالیٰ اپنے لیے تخلیق کر لے یا خاص کر لے تو اس کی بابت انسان کے ساتھ کیا علم ہو گا؟ آج کا جدید سائنس بھی یہ دریافت نہ کر سکا کہ دل و دماغ کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟ دونوں کے مابین انسانی جذبات کے حوالے سے کیا رشتہ ہے؟ فیصلہ صادر کرنے میں کس کا کردار اہم ہے؟ یہ ایسے سوالات ہیں کہ جدید دور کا انسان اور سائنس دونوں اس کے آگے خاموش ہیں۔ یہی وجوہ ہیں جن کی وجہ سے میر دؔل کو لاادریت کی علامت میں برتتا ہے۔ جیسے:

سمجھا بھی تو کہ دل کسے کہتے ہیں ، دل ہے کیا
آتا ہے جو زباں پہ تیری ، بار بار دل[36]

تصوف کے میدان میں دل کو ایک بلند مقام اور مرتبہ حاصل ہے کیوں کہ تصوف میں ہر عمل و کیفیت کا تعلق دل سے ہوتا ہے اور دل بلا واسطہ اللہ تعالیٰ کی تجلیات، عجائبات اور فیوضات سے منسلک ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے جو تجلیات اور عجائبات آشکارہ ہوتے ہیں صوفی یا صاحب کشف انھیں بصیرت کی مدد سے دیکھ پاتے ہیں کیوں کہ دنیاوی آنکھ میں یہ طاقت نہیں ہے کہ خالق کائنات کی جانب سے تجلیات کو اپنے اندر جذب کر سکے۔ اس ضمن میں اقبال کا کہنا ہے:

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دلوا کرے کوئی[37]

میرؔ ایک شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ صوفی بھی ہے اس لیے دل کو مقام استعجاب کی علامت گردان کر چشم بصیرت سے وابستہ کر دیتا ہے:

دل دل لوگ کہا کرتے ہیں، تم نے جانا کیا ہے دل
چشمِ بصیرت وا ہووے تو عجائب دید کی جا ہے دل[38]

اسی بصیرت کے لیے میرؔ کبھی کبھی چشم بصیرت کی ترکیب وضع کرتا ہے:

چشم دل کھول اس بھی عالم پر
یاں کی اوقات خواب کی سی ہے[39]

باطنی علم کے حوالے سے اصحاب تصوف خوب جانتے ہیں کہ اسی کا تعلق زیادہ تر دل سے ہوتا ہے۔ عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ دل خون کا ایک لوتھڑا ہے جب کہ صوفی اور صاحب کشف کے واسطے یہ ایک روح کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے جو نورانیت، روحانیت، تجلیات، الہام، القا اور کشف کا نزول ہوتا ہے، اس کا ٹھکانا صرف اور صرف دل ہی ہے۔ اگر دل اللہ کی محبت اور نورانیت سے بھر جائے تو انسان زمین پہ رہتے ہوئے عرش معلیٰ تک کا سفر ایک پل میں طے کر سکتا ہے جس کے نتیجے میں اسی دل کے اندر کشادگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لیے اہل تصوف کے ہاں دل کا مقام و مرتبہ بہت اونچا ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا ہے کہ میرؔ ایک شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ صوفی بھی تھے اس لیے وہ دل کو کشادگی کی علامت میں پیش کر کے اس کی عظمت میں اور بھی اضافہ کر دیتا ہے۔ جیسے:

صحرا کو جیسے کشادہ دامن ہم تم سنتے آتے ہیں
بند کر انکھیں ٹک دیکھو تو، ویسا ہی صحرا ہے دل[40]

اوج و موج کا آشوب اس کے لے کے زمیں سے فلک تک ہے
صورت میں تو قطرۂ خوں ہے، معنی میں دریا ہے دل[41]

اسی طرح میرؔ کہیں کہیں دل کو دورنگی کی علامت میں پیش کرتا ہے:

اب گرم و سردِ دہر سے یکساں نہیں ہے حال
پانی ہے دل ہمارا کبھی، تو کبھی ہے آگ[42]

درج بالا تمام بحث کا ثمر یہ ہے کہ دوسرے تمام شعرا کی طرح میرؔ نے بھی اپنی شاعری میں علامتوں کے ایک وسیع میدان کو جگہ دی ہے جن میں "دل" اس کی شاعری کی سب سے واضح اور نمایاں علامت کی حیثیت کا حامل ہے۔

تصوف کی دنیا کے ایک پیراک ہونے کی وجہ سے دل اس کے لیے اہم سے اہم تر بنتا جاتا ہے۔ یہ آرٹیکل میرؔ کی شاعری میں دل کی علامتی حیثیت کا احاطہ کرتا ہے اور بہ بانگ دہل یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس کے کلام میں دل کی علامت مختلف جہات رکھتی ہیں۔

حوالہ جات

1 میرؔ، میر تقی، کلیاتِ میرؔ، مرتبہ: ڈاکٹر علی محمد خان، لاہور، الفیصل، 2013ء، ص73

2 ناسخؔ، امام بخش، کلیات ناسخ، ناشر: منشی نول کشور، دہلی، انجمن ترقی اردو (ہند)، 1907ء، ص75

3 میرؔ، میر تقی، کلیاتِ میرؔ، مرتبہ: ڈاکٹر علی محمد خان، لاہور، الفیصل، 2013ء، ص74

4 مولانا محمد نذیر، نقشبندی، مفتاح العلوم(شرح مثنوی مولانا رومؒ)دفتر اول، لاہور، الفیصل، 2022ء، ص62

5 میرؔ، میر تقی، کلیاتِ میرؔ، مرتبہ: ڈاکٹر علی محمد خان، لاہور، الفیصل، 2013ء، ص75

6 ایضاً، ص640

7 ایضاً، ص76

8 ایضاً، ص76

9 محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (فارسی)، مرتبہ ومترجم: پروفیسر حمید اللہ ہاشمی، لاہور، مکتبہ دانیال، س ن، ص1100

10 غالبؔ، اسد اللہ خان، دیوانِ غالبؔ، مرتبہ: عبدالحق، خطی نسخہ، نئی دہلی، نیشنل مشن فار مینسکرپٹس، 2021ء، ص16

11 میرؔ، میر تقی، کلیاتِ میرؔ، مرتبہ: ڈاکٹر علی محمد خان، لاہور، الفیصل، 2013ء، ص77

12 ایضاً، ص79

13 ایضاً، ص107

14 ایضاً، ص80

15 ایضاً، ص91

16 ایضاً، ص89

17 ایضاً،158

18 ایضاً، ص 114

19 میرؔ،میر تقی، کلیاتِ میرؔ، مرتبہ:ڈاکٹر علی محمد خان،لاہور،الفیصل،2013ء، ص 201

20 ایضاً، ص230

21 غالبؔ،اسداللہ خان،دیوانِ غالبؔ، مرتبہ: عبدالحق، خطی نسخہ، نئی دہلی، نیشنل مشن فار مینسکرپٹس، 2021ء، ص106

22 میرؔ،میر تقی، کلیاتِ میرؔ، مرتبہ:ڈاکٹر علی محمد خان،لاہور،الفیصل،2013ء، ص247

23 اقبال، بانگِ درا، لاہور، اقبال اکیڈمی، 2018ء، ص227

24 میرؔ،میر تقی، کلیاتِ میرؔ، مرتبہ:ڈاکٹر علی محمد خان،لاہور،الفیصل،2013ء، ص247

25 غالبؔ،اسداللہ خان،دیوانِ غالبؔ، مرتبہ: عبدالحق، خطی نسخہ، نئی دہلی، نیشنل مشن فار مینسکرپٹس ،2021 ء، ص16

26 میرؔ،میر تقی، کلیاتِ میرؔ، مرتبہ:ڈاکٹر علی محمد خان،لاہور،الفیصل،2013ء، ص249

27 ایضاً، ص253

28 ایضاً، ص277

29 ایضاً، ص255

30 ایضاً، ص257

31 ایضاً، ص305

32 ایضاً، ص338

33 ارسلان بن اختر، مولانا، اللہ کے عاشقوں کی عاشقی کا منظر، کراچی، مکتبہ ارسلان ،2003ء ، ص26

34 ایضاً، ص339

35 محمد شفیع، مفتی، دل کی دنیا، کراچی، مکتبہ معارف القرآن، س ن، ص41

36 میرؔ،میر تقی،کلیاتِ میرؔ،مرتبہ:ڈاکٹر علی محمد خان،لاہور،الفیصل،2013ء،ص420

37 اقبال،بانگِ درا،لاہور،اقبال اکیڈمی،2018ء،ص128

38 میرؔ،میر تقی،کلیاتِ میرؔ،مرتبہ:ڈاکٹر علی محمد خان،لاہور،الفیصل،2013ء،ص421

39 میرؔ،میر تقی،کلیاتِ میرؔ،مرتبہ:ڈاکٹر علی محمد خان،لاہور،الفیصل،2013ء،ص 648

40 ایضاً،ص421

41 ایضاً،ص421

42 ایضاً،ص408